پروفیسر ڈاکٹر حیدر سندھی

چھٹی قسط

سندھی ادب کا مختصر جائزہ

شعری اصناف، اپنے تاریخی تناظر میں

حافظ حامد بھی زیرِ نظر زمانے کے تھے اور ان کا شمار بھی ممتاز سندھی غزل گو شعراء میں ہوتا ہے۔ یہ اگرچہ پیدائشی نابینا تھے، لیکن فطرت نے انہیں بڑی وسیع بصیرت عطا کی تھی۔ آپ نے سندھی غزل میں مشہور سندھی قصے سسی پنھوں کو تمثیل کے طور پر شامل کر کے تاریخ میں نئی جگہ بنائی ہے۔ آپ کو غزل میں اس لیے بھی خصوصی مقام ملا کہ آپ نے ایک مصرع فارسی غزل کا اور ایک مصرع سندھی کبت کا اس طرح آپس میں پیوستہ کیا کہ خیال کی نزاکت، موضوع کی لطافت اور نفاست کا بھرپور تاثر قائم رہا۔ ایسے کلام کا انداز اس طرح کا تھا:

گفتش رحمی بکن تیغ، نظر بردل مزن (کذا)
کہا، موں کھے چاک چھریل تھا وچھوڑیل ونن
(مجھے گہرے گھاؤ اور کرچیاں بہت اچھی لگتی ہیں)

فاضل شاہ بھی عروضی شعراء کے صف اول میں بیٹھے ملتے ہیں۔ آپ بھی صاحب دیوان شاعر تھے آپ کا دیوان فاضل شائع ہو چکا ہے۔ آپ سندھی کے قادر الکلام شاعر تھے اور دیوان فاضل میں غزل کے علاوہ قصائد، مخمس، مسدس، ترجیع، بند اور تاریخی نظمیں شامل ہیں۔ علاوہ ازیں ایک نئی روایت بھی نظر آتی ہے جس کی رو سے ماسوائے آپ کے نام کے، پوری پوری ''غزلیں بغیر نقطوں'' والے حروف سے تخلیق ملتی ہیں۔

فاضل شاہ نے ہجوگوئی اور ہجو نویسی بھی کی۔ ہے آپ کو علم عروض پر اس قدر مہارت حاصل تھی، کہ آپ نے ''؟میزان الشعرا'' نامی کتاب تحریر کی ہے۔ غزل اور ہجو کے علاوہ آپ ''کافی'' کی صنف کے بھی بلند پایہ شعراء میں شامل ہوتے ہیں۔ آپ کی تصانیف میں دیوان فاضل شاہ، کافیون، میزان الشعر، تفسیر فاضلیہ، تفسیر بسم اللہ اور صفات باری تعالیٰ شامل ہیں۔ آپ کی اور تصانیف یا تخلیقات کی زبان اگر چہ سندھی ہے لیکن اس میں فارسی اور عربی کی کافی آمیزش کی گئی ہے۔ تاہم سندھی لغات سے خالص اور ترسندھی الفاظ بھی کثرت سے استعمال کیے ہیں۔

غلام محمد شاہ بھی غزل گو شاعر تھے اور ''گدا'' اپنا تخلص کرتے تھے۔ مجاز اور بے باکی کا اظہار آپ کی خصوصیات تھیں۔ آپ نے سندھی میں نعت، منقبت مستزاد، مثنوی، قصائد اور اردو فارسی کلام کافی تخلیق کیا ہے۔ یہ سارا کلام کلیات گدا میں شامل ہے۔ آپ کے کلام کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے:

لب جاناں تے تھیو (ہوا) خال (تل) مؤمسبر پیدا،

حوض کوثر تے تھیو (ہوا) حضرت قمبر پیدا،

عشق خدا میں چھونہ (کیوں نہ) کریں زندگی بسر، طالب جے آھیں (اگر طالب ہو) حق جو (حق کے) تہ عشق بتان نہ کر۔

اے دلربا، گلگون قبا، تا کی کنی برمن خفا

بر ایں گدائے مبتلا، نام خداموں ڈے تہ ڈس (۸۲)

میر عبدالحسین بھی ہمہ رخ شاعر تھے۔ ''سانگی'' ان کا تخلص تھا۔ ''دیوان سانگی'' ان کا مجموعہ کلام ہے جو شائع ہو چکا ہے۔ لیکن اس عہد کے شمس الدین ''بلبل'' بسیار گو سندھی شعراء میں شامل ہیں۔ آپ نے غزل اور کافی کی شاعری کے علاوہ ظرافت اور طنز ومزاح میں بڑی

نیک نامی کمائی۔ آپ کی ہر صنف میں بے پناہ مقبولیت کا پہلو ملتا ہے۔ آپ کے کلام سے وہ اقتباس پیش کیا جاتا ہے جو آپ نے انگریزی طرزِ زندگی گزارنے والوں پر اس وقت طنز کرتے ہوئے منظوم کیا، جس وقت اہلِ سندھ سمیت برصغیر کے عوام اور خصوصاً مسلمان انگریزوں اور انگریزی تعلیم کے مخالف تھے۔

گلابند، کالر، ہاف کوٹ! گھڑی، پتلون، چشمے چروٹ! قمیص کف دار، جاکٹ، جراب، سلیپر سپاٹے، سلانا ٹواب.....

انگریزی دور

اگرچہ ان اشعار سے انگریزوں، ان کے لباس اور زبان سے نفرت کا اظہار ہوتا ہے لیکن ملکی تاریخ میں ۱۷۸۳ء سے لے کر ۱۸۴۳ء تک کا دور ایک ایسی زنجیر کی طرح ہے جس کا ایک سرا کلہوڑا دور سے جڑا ہوا ہے اور دوسرا انگریزی عہد سے پیوستہ ہے۔ یہی عرصہ ''تاریخ تالپور'' کو کلہوڑا اور انگریزوں کی حکمرانی کے درمیانی تسلسل جوڑنے کا موجب بنتا ہے۔

کلہوڑوں سے اقتدار حاصل کرنے والے تالپور میر بھی علم پروری اور اہل علم وفن کے قدردان اور سرپرست تھے، جس کی وجہ سے سندھی ادب اس دور میں انتشار اور افراتفری کا شکار ہونے کی بجائے ترقی کا حامل رہا۔ اس دور میں میروں میں ہی ''عطار''، ''عظیم''، اور ''مینا'' وغیرہ کے تخلص کے حامل شعراء نے شہرت حاصل کی۔ میر مراد علی خان تو سندھی اور فارسی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی شاعری کرتے تھے۔ میر نصیر خان کا تخلص ''جعفری'' تھا اور میر صوبدار خان ''شاہنامہ سندھ'' کے خالص تھے (۸۳) ان کی یہ تخلیقات انہیں سداحیات رکھے ہوئے ہیں۔

مذکورہ دور کے سندھی ادب پر فارسی اثر غالب تھا اور بہت ساری فارسی کی شعری

اصناف، سندھی ادب کا حصہ بنیں۔ سید مرتضیٰ شاہ کا تعلق اسی زمانے سے تھا، جنھوں نے فارسی بحر و وزن کے تحت مثنوی کے انداز میں ''شاہ نامہ'' اور ''سکندر نامہ'' منظوم کیے۔ قبل ازیں پورے برصغیر میں ''چھند کے اصولوں'' پر مبنی شاعری کا رواج تھا اور یہی ریت سندھی میں بھی پختہ تھی، لیکن اس نئے شعر رجحان نے مختصر عرصے کے اندر سندھی تخلیق کاروں میں بھی مقبولیت حاصل کرلی، جس کا ثبوت اس زمانے میں ''ہیر رانجھا''، ''سسی پنہوں''، ''لیلیٰ مجنوں'' اور دوسری اس طرح کی مقبول و مشہور داستانوں کی مثنوی کے انداز میں موجودگی سے ملتا ہے۔

تاریخ کے اس عہد میں اصلاحی، اخلاقی اور قومی اہمیت کے موضوعات منظوم ہوکر ادب کا حصہ بنے۔ اللہ بخش ''ابوجھو'' اسی زمانے کے ہیں جنھوں نے ''مسدس حالی'' کی طرح ''مسدس ابوجھو'' تخلیق کی۔ علاوہ ازیں فارسی کی شاعری، غزل کا رواج بھی ان ایام میں بہت زیادہ نظر آتا ہے لیکن فارسی غزل کا آغاز سچل سرمست (۱۷۳۹ تا ۱۸۲۶ء) کر چکے تھے۔ تاہم زیریں سندھ کے علاقہ ''ٹرکھڑ'' کے ''ٹرکھڑائی'' شعراء فارسی کی مختلف شعری اصناف کو سندھی ادب میں شامل کرنے کی وجہ سے ادبی تاریخ میں نمایاں ہوئے۔ یہ ان شعراء کی خدمات کا کمال تھا کہ غزل کے علاوہ رباعی، مخمس، مسدس، مثنوی اور منقبت جیسی خالص فارسی کی شعری اصناف اس قدر سندھی میں مقبول ہوئیں کہ روائتی عنوانات کے تحت اور چھند کے قدیم اصولوں پر مشتمل پختہ شعری روایت ماند ہوتی نظر آتی ہے۔

اس عہد کے خلیفہ ''گل'' (دیوانِ گل) اور غلام شاہ ''گدا'' (دیوانِ گدا) بھی بڑے نمایاں شعراء گزرے ہیں، لیکن میر عبدالحسین خان ''سانگی'' (۱۸۵۱ تا ۱۹۲۴ء) جن کی والدہ انگریز تھی اور خود تالپور حکمران کی اولاد کے ناطے شہزادہ تھے (اور جن کا جنم ان کی والدہ کی جلاوطنی کے ایام میں کلکتہ میں ہوا تھا) اس کے باوجود ان کو فارسی، اردو اور سندھی زبانوں پر

عبور حاصل تھا۔ تین جلدوں پر مشتمل ''دیوان سانگی'' ان کی شعری صلاحیتوں کی دلیل ہے۔ ''لطائف لطیفی'' کے نام سے تصنیف، شاہ عبداللطیف بھٹائی سے ان کی عقیدت کا اظہار اوران کے فکر وفن سے گہری واقفیت کا ثبوت ہے۔ سید فاضل شاہ جوکہ ''دیوان فاضل شاہ'' اور ''کافین جو کتاب'' کے خالق ہیں، ان کا زمانہ بھی یہی سانگی کا ہے۔ انہوں نے ''میزان شاعری'' لکھ کر فارسی شاعری کے قواعد وضوابط سمجھائے۔ ہیں۔ مرثیہ کی شاعری بھی انہی قواعد کی محتاج ہوتی ہے۔

مرثیہ نویسی کا آغاز اگرچہ 'سرکیدارہ' کے ذریعے شاہ عبداللطیف بھٹائی ۱۷ ویں عیسوی صدی میں کر چکے تھے، جن کی پیروی کرتے ہوئے مخدوم عبداللہ ٹھٹوی، مخدوم عبدالرؤف اور سچل سرمست وغیرہ نے سندھی میں مرثیے کے مضمون اور مفہوم کو ''دوھڑے'' اور ''بیت'' کی روایتی شاعری میں سمویا تھا، لیکن اس کے لئے الف اشباع کی شاعری بھی استعمال ہوتی رہی۔ اس قسم کی شاعری کو ایک صنف کے طور پر سندھی میں سید ثابت علی شاہ (۱۷۴۰ تا ۱۸۱۰ء) نے رواج دیا۔ سید ثابت علی شاہ نے ''ہجونگاری'' کو بھی عام کیا۔ ان کے ہمعصر سید اسداللہ شاہ حسینی بھی مرثیہ گوئی میں کافی مشہور تھے، لیکن سید ثابت علی شاہ کے مرثیے اثر انگیزی، درد، سوز، سلاست، سیرت نگاری، کردار نگاری اور حقائق نگاری کے پیکر ہیں۔ الغرض تالپور دور اپنے ساتھ روایتی سندھی شعری انداز لیتے ہوئے فارسی علم عروض کی حامل شعری اصناف کے ہمراہ انگریزی عہد میں داخل ہوا، جہاں انگریزوں کی کوششوں سے سندھی زبان وادب کو ترقی اور وسعت کے مواقع ملے۔

سر جارج کلارک نے سندھ میں سندھی زبان کو دینی تعلیم اور بنیادی کاروبار چلانے کے قابل گردانا اور اپنے مشاہدے ارتجربے کی بنیاد پر ایک مثبت سفارش تیار کر کے ایسٹ انڈیا

کمپنی کیڈائریکٹرز کو بھیجی۔ اس سفارش میں کہا گیا کہ: ''سندھی کو سرکاری اور دفتری زبان بنانے کا حکم نامہ جاری کیا جائے۔'' (۸۴) بعد ازاں ۱۸۵۳ء میں موجودہ رسم الخط کو معیاری مانتے ہوئے قابلِ استعمال قرار دیا گیا۔ یہ ہی رسم الخط تھا جسے ''سندھی عالم مخدوم ابوالحسن جی سندھی'' کے نام سے اہلِ سندھ صدیوں پہلے سے استعمال میں لاتے رہے تھے۔ چنانچہ مذکورہ رسم الخط کو منظوری ملنے کے بعد سندھی زبان کو لازمی تعلیم وتدریس اور سرکاری یا نجی سطحوں پر رائج کرنے کے بھی احکامات جاری کیے گئے۔ (۸۵)

اس رسم الخط میں پہلی کتاب ''فن'' پر ''چترجی پاڑ'' (فن کی ابتدا) کے نام سے شائع ہوئی۔ (۸۶) دوسرے لفظوں میں ۱۸۴۳ء میں سندھ پر انگریزوں کا قبضہ ہوا اور دس سال بعد نہ صرف کتاب شائع ہوئی بلکہ پریس کا کام بھی شروع ہوا۔ ان دونوں اقدامات نے سندھی علوم وفنون کے فروغ کی زمین ہموار کرنے کے علاوہ لوگوں کو اپنی زبان میں لکھنے پڑھنے کا موقع ملا اور علماء، اساتذہ اور ماہرین تعلیم وتدریس کو بہتر سے بہتر مواد پر مشتمل کتابیں عوام تک پہنچانے کی ترغیب ملی۔

تھوڑے ہی دنوں میں سندھ کے بڑے بڑے شہروں میں اشاعتی مراکز، کتب فروشوں کی دکانیں اور کتابوں کا کاروبار کرنے والوں کے لیے روزگار کی راہیں کھلیں۔ جدید تعلیمی تقاضوں کے مطابق تعلیم وتدریس اپنانے اور نصاب تیار کرنے کی ضرورت کے پیشِ نظر اساتذہ کے تربیتی ادارے قائم ہوئے۔ یونیورسٹی تعلیم کی ضرورت کے پیشِ نظر ۱۹۲۴ء میں فوری طور پر بامبے یونیورسٹی کو سندھی میں تعلیم دینے اور سندھی میں امتحان لینے کا اختیار دیا گیا۔ بامبے یونیورسٹی نے ''سندھی نصاب کمیٹی'' قائم کی جسے بعد میں ''سندھی ٹیکسٹ بک بورڈ'' کا نام دیا گیا۔ (۸۷)

جونی سندھی زبان کو ترقی کرنے کے مواقع میسر آئے علماء، اساتذہ، ماہرین اور اہلِ قلم کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہوا اور انھوں نے اپنی سرگرمیاں بڑھا دیں۔ یہ انہی ذمہ دار لوگوں کی کامیاب کوششیں تھیں کہ مختصر مدت کے اندر سندھی میں مضمون نویسی، ڈرامہ نگاری، تاریخ، انشا پردازی، جغرافیہ، جیومیٹری، ریاضی، سیاست، سماجیات، زراعت، منطق، معاشیات، باغبانی، افسانہ نویسی، ناول نگاری، لغات نویسی، قانون اور فلسفے وغیرہ جیسے دقیق مضامین پر کتابیں شائع ہوتی چلی گئیں۔ جن مضامین پر نصابی کتب کی ضرورت پیش آتی گئی، نہ صرف ان کے لئے کتابیں بلکہ ان کے لئے محاورے، اصطلاحیں اور مساوی لغات کی ترتیب وتخلیق کے ذریعے بھی کام مکمل کیے گئے۔ ان کاموں کی تکمیل میں دیوان کوڑومل، میاں محمد حیدرآبادی اور دیوان نندی رام وغیرہ سب سے آگے نظر آتے ہیں۔ دیوان نندی رام پہلے ماہرِ تعلیم تھے، جنہوں نے جیومیٹری کی سندھی اصطلاحیں، تز الفاظ اور مناسب محاورے، تراکیب مرتب کرکے جیومیٹری جیسے مشکل مضمون کو آسان بنادیا۔ (۸۸)

نئی نثر کے اسی ابتدائی زمانے میں نصابی کتب کے علاوہ تاریخ سندھ (نندیرام) ہندوستان جی تاریخ (اردو سے ترجمہ قاضی غلام علی)، بھیجے زمیندار جی گالھ (میاں غلام حسین)، سندھی ویاکرن (گرائمر، ادھارام) چٹر جی پاڑ (فن کی ابتدا)، منیرام، سدھا تو روئیں کدھا تورو (سید میراں محمد شاہ) لیکھے جی پیڑھ (میتھی میٹکس=نندیدام) آکاسی نردار (سید میراں محمد شاہ علم ہیئت)، جبر ومقابلہ=الجبرا (وشوناتھ)، سندھی صرف ونحو (میاں محمد حیدرآبادی) وغیرہ بھی شائع ہوئیں۔

نیز اسی زمانے میں تعلیمی شعبے کو مزین کرنے کے لئے درج ذیل تصانیف شائع ہوئیں۔ دھرتی نردار (عالمی جغرافیہ)، ''پیمائشی-حساب'' دنیا جی تاریخ، لیکھے جو حساب دو حصے

(آسان حساب)، رائے ڈیاچ جو قصو، سنساری نہوار (مطالعہ فطرت)، جغرافیہ جدید (دو حصے)، مفید الطالبین=ادھارام، سندھ جی تاریخ، کولمبس جی تاریخ، تاریخ انگلستان، ہندوستان جی تاریخ، انڈین پینل کوڈ، شاہ جو رسالو (جرمن سکالر ڈاکٹر ٹرومپ) انگلینڈ جی تاریخ (۲ جلدیں) اصول علم طب، سیتلا جا ٹکا (معلومات عامہ) دیوان گل، کام سین ئیں کامروپ (منظوم کہانی)، انگی حساب (ارتھ میٹک)، گل شکر (ضرب المثل)، گل (اقوال دین اور کہاوتیں) دل جا حساب (زبانی حساب اور ان کے طریقے)، وکیو ڈاتار (تفریحی مواد)، دلورائے جو قصو (نیم تاریخی قصہ)، سیف الملوک، عمر ماروی، سسئی پنہوں، قصو مہر منیر، مفتاح القلب (علم منطق)، جواہر اللغات، میزان الشعر، دیوان قاسم، سندھی انگریزی ڈکشنری اور کاشف الغموص (الفاظ کے اشتقاق اور معنیٰ)۔ (۸۹)

ان کے علاوہ جو لغات اور ڈکشنریز دنیا کے ممتاز سکالرز مثلاً وائٹن، ایسٹوک، لیچ اور جارج سٹیک وغیرہ نے ترتیب دیں، (۹۰) وہ اس قدر جامع اور جدید پیرائے میں مرتب کی گئیں کہ دورِ حاضر میں بھی ان کی اہمیت وافادیت اپنی تخلیق کے زمانے کی طرح برقرار رہی۔ ٹیچرز ٹریننگ کالج کے پرنسپل کوڑومل نے اسی زمانے میں مخطوطے کی شکل میں موجود اہم شعری مجموعے کو ''سامی جا سلوک'' کے نام سے شائع کرایا۔ اس کے لئے نقادوں کا خیال ہے کہ ''سامی جا سلوک کی علمی حیثیت اور شاعرانہ عظمت ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے.....'' یہ شاعری ویدانتی کلام کا یک بہترین نمونہ ہے۔ (۹۱)

اسی زمانے میں آخوند لطف اللہ (۱۸۴۳ء-۱۹۰۲ء) نے ہندی سے 'فسانہ عجائب'' کا سندھی میں ''گل خنداں'' کے نام سے ترجمہ کیا۔ جس طرح انہوں نے مکمل قصے کو نثر مقفیٰ اور نثر مسجع میں پیش کیا ہے، یہ نہ صرف ان کی ذہانت وصلاحیت کا اعلیٰ ثبوت ہے، بلکہ اس سے

کتاب کی اہمیت اصل کتاب سے بھی بڑھ گئی ہے۔

انہی ایام میں حاجی امام بخش خادم (شکارپوری ۱۸۶۱ء تا ۱۹۱۸ء) نے ۱۸۷۹ء میں ڈرامہ ہیر رانجھا لکھا۔ اس ڈرامے میں بہترین نثر نگاری پیش کی گئی ہے۔ اس ڈرامے کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری بھی ''کلیات خادم'' کے نام سے شائع ہوئی۔

جدید انداز سے طنزیہ اور ظریفانہ شعر اور اعلیٰ صفات کی نثر شمس الدین بلبل (۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۹ء) نے بھی لکھی۔ ان کی نثر نویسی کا یہ انداز بہار عشق، ظریف الدولہ اور گلزار لطائف وغیرہ میں دیکھا جاسکتا ہے۔ انہیں نثر مقفیٰ پر جو عبور حاصل تھا، اس کا ثبوت انھوں نے اپنی تصنیف ''قلندر جو میلو'' میں پیش کیا ہے۔ اس سندھی کتاب سے ایک اقتباس اردو میں پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے:

''..... میلے میں پیر فقیر، امیر نواب..... غریب قصاب، ذرڑا زمیندار، چور چکار، کڑا کاموڑا، رئیس سردار، بازیگر راندیگر، جوگی ٹھوگی، لنگھا، ڈوم، بھٹ، دلال، کنجریوں قوال، ٹوٹر آ کڑباز، گرہ کپ، جواباز کے علاوہ ہر ملک سے ہر قسم کے انسان، سوداگر و سامان، ہر جنس ہر حیوان، ہر ساز، ہر باز، ہر حسین اور ہر ناز۔۔۔'' آ کر ایک مقام پر اکھٹے ہوتے ہیں۔ (۹۲)

اگر چہ نثر و نظم دونوں اصناف میں تصانیف کی دھڑا دھڑ اضافہ ہورہا تھا، لیکن جو کام مرزا قلیچ بیگ (۱۸۵۵ء تا ۱۹۲۹ء) نے کیا اور تاریخ میں اپنے لئے منفرد مقام پیدا کیا، اس کی مثال دیگر زبانوں کی تاریخوں میں بھی شاید ہی ملتی ہوگی۔

مرزا قلیچ بیگ ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز تھے، جہاں سے انہوں نے محض سندھی زبان وادب کی ترقی کی خاطر استعفیٰ دیا۔ انہوں نے تن تنہا چار سو سے زائد کتابیں لکھیں۔ ان تصانیف میں تراجم بھی تھے اور تحقیق بھی، تاریخی بھی تھے اور نصابی بھی، نثری بھی

تھے اور منظوم بھی، ڈرامہ، افسانہ، ناول اور بچوں کا ادب بھی تھا اور تعلیمِ نسواں کے علاوہ فلسفے اور سوانح حیات کے متعلق مواد بھی تھا۔ ان تصانیف میں فن لطیف اور آرٹس کے متعلق بھی ہیں اور زراعت، باغبانی جیسے سائنسی علوم اور سائنس پر بھی، تذکرے بھی ہیں اور تاریخیں بھی، سندھی شاعری بھی ہے اور انگریزی بھی۔ غرضیکہ انہوں نے اتنی سرگرمی سے یہ کتابیں سندھی ادب کی گود میں ڈالنی شروع کیں کہ ان کے دوستوں نے انہیں ''چھاپہ خانہ'' کہنا شروع کردیا تھا۔ ان کی ان خدمات کے عوض انہیں شمس العلماء کا خطاب دیا گیا تھا۔ آپ نے ناول بھی کافی لکھے ہیں لیکن ''زینت'' اتنا اعلیٰ اور معیاری ہے کہ جرمن سکالر و محقق ڈاکٹر این میری شمل نے اس کی اپنی انگریزی کتاب ''سندھی لٹریچر'' میں بڑی تعریف کی ہے۔ ان کا ڈرامہ ''خورشید'' اور ''لیلیٰ مجنوں'' کو تو بنیادی ڈراموں میں بھی شامل کیا جاتا ہے جو انہوں نے ۱۸۸۰ء میں تخلیق کیے۔

مرزا صاحب اور ان کے ہمعصر اہلِ قلم کی کوششوں کے طفیل ہر قسم کی نصابی، تعلیمی، تدریسی اور تربیتی کتب جن میں آرٹس، سائنس، فن اور ہنر وحرفت کے متعلق سندھی میں موار مہیا ہوا جس کی وجہ سے ایک طرف پڑھنے والوں میں اور دوسری طرف پڑھانے اور سکھانے والوں میں اپنی مادری زبان کے ذریعے تعلیم وتربیت دینے کا شوق بڑھتا ہی چلا گیا۔

ایک طرف قانون کی ہر قسم کی اصطلاحیں اور محاورے مروج ہوتے گئے تو دوسری طرف جامعاتی تعلیم کی سطح پر معاشیات، ریاضی، سیاسی، علم اللسان، صوتیات، تاریخ، جغرافیہ، ریاضی، معلومات عامہ، ابلاغ عامہ، بین الاقوامی تعلقات، علم منطق، فلسفہ، علم تعلیم اور علم صحافت، نظریاتی یا عملی صورتوں میں نہ صرف پڑھانے میں آئے بلکہ ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی تک کی ڈگریاں بھی ایوارڈ ہونے لگیں۔

یہی وہ دن تھے جب سندھی میں گفتگو کا اشاراتی (Signaling) نظام مستحکم ہوا جو یہاں صدیوں سے رائج تھا۔ یہ نظام ابتدا میں اگرچہ سماجی ضروریات کے تحت چلتا تھا اور اہلِ سندھ نے انگریزوں سے جتنی بھی جنگیں لڑیں، ان میں مذکورہ نظام، خفیہ پیغام رسانی کے لئے استعمال کرتے رہے، لیکن انگریزوں کے راج کے دوران بھی نظام گفتگو سکاؤنگ، فوج، تاجر، سمندری جہاز ران، کشتی بان، خلاص، ملاح اور مچھیرے وغیرہ اپنی سہولت کے لئے سیکھتے اور اس سے استفادہ کرتے رہے۔

اسی زمانے میں سندھی کی اصطلاحوں، دفتری، دینی، اقتصادی، سرکاری سرگرمیوں، زراعت، علمی کارگزاریوں، قانون اور قانونی تشریح، عدالتی فیصلے لکھنے، وکیلوں کی جرح، دلائل، سوال وجواب اور صحبتیں، منصفوں کی آراء، مقدمات کی عبارت، نقول اور پولیس کی ہر قسم کی کارروایوں، ریونیو ریکارڈ، محصول کی وصولی اور ادائیگیوں کے محاوروں کو کتابوں کی شکل میں شائع کرنے کے علاوہ سندھی-فارسی، فارسی-سندھی، عربی-سندھی اور سندھی-عربی، انگریزی-سندھی اور سندھی-انگریزی لغات بھی شامل ہوئیں۔

لغات، فرہنگ اور ڈکشنریاں کسی زبان کی علمی وادبی زندگی کا اہم سرمایہ ہوتی ہیں۔ لغات کی بدولت جہاں کسی زبان کی شرازہ بندی کرنے میں مدد ملتی ہے، وہاں اس کی وسعت، جامعیت اور ہمہ گیری کا پتہ چلتا ہے۔ یہ لغات کا شعبہ ہی ہے جس کی مدد سے کسی زبان کی صرفی ونحوی حیثیت متعین کرنے میں سہولت اور اس زبان کے الفاظ، مفردات، تراکیب، تلمیحات، اصطلاحوں، تشبیہات اور محاوروں کو زمانے کی دست برد سے محفوظ بنایا جاسکتا ہے۔

لسانی سرمائے کی اس طرح حفاظت سے جہاں زبانوں کے استحکام اور اس زبان بولنے والوں کو اپنی بقاء کی ضمانت ملتی ہے، وہاں ان کوششوں سے ادب کو اپنے ماضی سے مربوط

کرنے میں بھی آسانی ہوتی ہے۔ اسی لئے مؤرخین ومحققین اس رائے کا بار بار حوالہ دیتے ہیں کہ ''وہی ادب اپنے معاشرے میں مفید اور مثبت کردار ادا کرسکتا ہے جس کا اپنے دور کے علاوہ اپنے ماضی سے بھی ربط قائم ہو۔'' (۹۳)

سندھی زبان اور ادب ہمیشہ حال کو ماضی کے ساتھ مربوط رکھتے آئے ہیں جس کی وجہ سے دونوں ہر دور میں اپنے معاشرے کے عکاس رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سندھی ادب کا مطالعہ کرنے سے سندھی سماج کے تمام پہلو اور ہر رخ کے ارتقائی مراحل معلوم ہوتے ہیں۔

دراصل دیگر معاشروں کی طرح سندھی سماج کے بارے میں بھی اس کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یا ماضی کے حالات وواقعات کے پس منظر کا تجزیہ کرنے سے سندھی سماج کے ارتقاء کے متعلق معلومات مل سکتی ہیں کیونکہ ہر تاریخ پر مجبوریوں کا ملمع چڑھا ہوتا ہے۔ اس لئے ہر معاشرے کے اصل حقائق محض تاریخ کے تناظر میں معلوم ہی نہیں ہوسکتے۔

اس طرح کی باتیں صرف سندھی ادب کا جائزہ لینے سے معلوم ہوسکتی ہیں کہ سندھی شعراء اور ادیبوں نے اپنی تخلیقات اور قلمی کاوشوں کو ہمیشہ مصلحت کوشی سے آزاد رکھا ہے۔ جب کبھی حالات نے انہیں اخوت، رواداری، پیار ومحبت، حق اور سچ لکھنے سے روکا تو انہوں نے اس ممانعت کی پروا کیے بغیر ہمیشہ حقائق کی حمایت کی۔

بیسویں صدی کا سندھی ادب

ادب کا یہی انداز لیے ہوئے سندھی ادبی تاریخ جب بیسویں صدی میں داخل ہوئی تو برصغیر کی تاریخ پہلے ہی کروٹ بدل چکی تھی۔ پہلے جو سیاسی منظر میں ''متحدہ مسلم امت'' کے متعلق سرگرمیاں دکھائی دیتی تھیں، اس میں تبدیلی نظر آنے لگی۔ یہ تبدیلی اس وقت نمایاں ہوئی

جب سارے برصغیر کی رائے عامہ سیاست کے دو دائروں کے گرد گھومنے لگی تھی۔ ایک سیاسی دائرہ کانگریس نے بنایا تھا جبکہ دوسرے دائرے کی تخلیق مسلم لیگ کے قیام کے بعد ہوئی۔ دونوں دائرے ایک دوسرے کے تضاد میں گردان تھے۔

قبل ازیں جو قلمکار، اہل علم اور اہل بصیرت وبصارت برصغیر میں ''متحدہ مسلم امت'' کی سوچ اور نظریے کی تائید وحمایت میں مصروف تھے، اب وہ سوچ بھی تقسیم ہوگئی اور مسلم لیگ کے خیال اور تصور کے حامی ہوکر ''مسلمانوں کے لئے الگ وطن'' کے حق میں دعوے اور دلائل دیئے جانے لگے۔ اس سیاسی منظر اور مناظرے دونوں کا اثر سندھ کی سیاست، صحافت اور ادب پر بھی پڑا۔

صحافت اور صحافیوں کا ایک دھڑا جو کانگریس کی حق میں رائے عامہ ہموار کر رہا تھا، اس میں سنسار سماچار، ہندوستان، ہندواسی، ہندو سنسار اور سوراج جیسے سرمائے دار اخبار اور ان کے مالکان شامل تھے جبکہ قیام پاکستان کی حمایت کرنے والا صرف ایک ''الوحید'' اخبار (روزانہ) تھا یا پھر چند ایک ہفتہ وار اخبار تھے جو مذکورہ بالا اخباروں کا بھرپور مقابلہ کررہے تھے۔ ایسے اخبارات وجرائد میں پاکستان کے موقف کی تائید وحمایت کرنے میں جو لکھنے والے تھے ان میں کشن ''چند'' ''بیوس'' اور حیدر بخش جتوئی سب سے پیش پیش تھے اور انہیں تندہی اور تیزی سے بے باک انداز میں لکھتا دیکھ کر کئی جوان سال اور جوشیلے قلمکاروں میں ولولہ پیدا ہوا۔

نو آموز قلمکاروں نے نئے تصورات اور خیالات کو مسلم مملکت کے قیام کے بارے میں اتنے مدلل اور منطقی انداز میں لکھا کہ یہ بہت جلد پڑھنے والوں میں اپنے لئے ایک وسیع حلقہ پیدا کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ ایسے ماحول کو ہموار رسالہ ''سندھو'' اور حیدرآباد سندھ میں قائم، سندھ مسلم ادبی سوسائٹی نے خوب گرمایا۔ ایک طرف سندھو نے اپنی اشاعتوں میں

کہنہ مشق اور تجربے کار قلمکاروں کے ساتھ ساتھ نو آموز لکھیاروں کی ہمت افزائی کی تو دوسری سندھ مسلم ادبی سوسائٹی نے اپنے تمام وسائل سندھی ادب کے فروغ کے لئے وقف کر رکھے تھے۔ ان کاوشوں کے تحت کئی قلمی مسودے، شہپاروں کی شکل میں پڑھنے والوں تک رسائی حاصل کر سکے۔

جہاں نئے نظریات کا حامل ادب سندھ میں سیاسی شعور پھیلا رہا تھا اور قیام پاکستان کے حق میں رائے عامہ ہموار کر رہا تھا، وہاں سماج کا ایک حصہ کانگریس کے پرچار کا بھی اثر لے رہا تھا۔ اس بات نے ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کو اپنی تحریروں اور تخلیقوں میں نئے خیالات، نئی سوچیں اور نئے تصورات پیش کرنے کا موقع فراہم کیا۔ اس وقت کی شاعری کا اندازہ درجہ ذیل کے ایک شعر کے ترجمے سے ہوتا ہے:

اٹھ، دکھا پھر سے وہ جوشِ ایمانی
آج جگ سارا دیکھنا چاہتا ہے تیرا جوشِ مسلمانی (۹۴)

جوش اور ولولہ سے بھرپور تحریر، تقریر اور تخلیق کی نمائندگی گوبند مالہی پہلے ہی ''نئیں دنیا'' کے توسط سے مسلم لیگ کے حق میں لکھنے سے کر رہے تھے، لیکن اب قیامِ پاکستان کی حمایت اور ترقی پسند خیالات کے فروغ کے لئے انہوں نے ''باغی'' نام سے اپنا ایک رسالہ جاری کیا۔ ''باغی'' میں مستقل لکھنے والوں میں شیخ ایاز ان دنوں بھی سرفہرست تھے۔

یہ رسالے نہ صرف شاعری کے ذریعے شعور اجاگر کرنے میں مصروف تھے اور موقف کی تائید حاصل کرنے میں پیش پیش تھے، بلکہ نثر نویسی کی تمام اصناف میں بھی اپنا مدعا اور مقصد پیش کر رہے تھے۔ ناول جس کی بنیاد مرزا قلیچ بیگ، معاشی، معاشرتی اور تاریخی موضوعات کے ذریعے پہلے ہی رکھ چکے تھے، اس دور کے دیگر سندھی قلمکار بھی بغیر مذہبی

تفریق اور مت بھید چھیڑے، ناول کی عمارت کی تزئین و آرائش کرنے میں سرگرم دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے تخلیق کاروں میں کہنہ مشق صحافی اور ناول نگار محمد عثمان ''ڈیپلائی'' سب سے نمایاں نظر آتے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف خود تاریخی، سماجی، مذہبی اور اصلاحی موضوعات کے حامل ناول لکھ کر قسط وار شائع کرنے کی ریت ڈالی، بلکہ اپنا ماہوار رسالہ ''عبرت'' نئے لکھنے والوں کے لئے بھی پیش کیا۔

یہی دور سندھی ڈرامہ نویسی کے لئے بھی زیادہ شاداب ثابت ہوا۔ جن ادیبوں نے ان ایام میں ڈرامہ نگاری کی طرف زیادہ توجہ دی، ان میں جیٹھ مل، گل راجانی اور عثمان علی انصاری وغیرہ قابلِ ذکر تھے جنہوں نے تخلیقی ڈراموں کے علاوہ شیکسپیئر کے مشہور ڈراموں کو سندھی زبان میں اس قدر دلچسپ انداز سے پیش کیا کہ اصل کے مقابلے میں ترجمہ زیادہ جاندار اور مؤثر معلوم ہوتا ہے۔

تحقیق کے میدان میں بھی تاریخی پس منظر میں اہم شعراء کی شاعری کا جائزہ لیا گیا۔ اس ضمن میں کئی ہندو اور مسلمان محققین نے الگ الگ انداز سے شاہ لطیف بھٹائی کے رسالہ میں موجود سروں میں پیش کیے گئے کرداروں کو ڈرامائی تشکیل دے کر سٹیج اور قارئین کے لئے پیش کیا گیا۔

جہاں یہ ادبی اور تحقیقی ترقی کے لئے کام ہورہا تھا، وہاں تعلیمی سرگرمیوں کو فعال اور بامقصد بنانے کی طرف بھی توجہ دی گئی۔ اس طرح ضلعی سطح سے لے کر اعلیٰ سیاسی قیادت تک سرگرم رہنماؤں کی سوانح حیات اور ان کے اقوال خواہ کارہائے نمایاں نصاب کے ذریعے نئی نسل تک پہنچانے کی سعی ہورہی تھی۔ اس سمت میں ڈاکٹر محمد عمر بن محمد (ع-م) داؤد پوتہ نے قلمکاروں کو انعام دینے کا اعلان کرکے ان میں مقابلے کا رجحان پیدا کیا۔ یہ اعلان تعمیری کوشش

ثابت ہوا اور کئی موضوعات پر نئے نئے انداز سے تاریخ، جغرافیہ، مذہبی اور معاشی مضامین کی حامل کتابیں اشاعت کا سبب بنیں۔ جن تصانیف کو انعام نہیں بھی ملا تو بھی رسائل اور اخبارات نے ان کے اقتباسات شائع کر کے انھیں شائع کرنے کا موقع پیدا کیا۔ ایسے جرائد اور معیاری رسائل میں باغی اُگتے قدم اور ساھت منڈل نے کافی شہرت حاصل کی تھی۔

اگر چہ ان ایام میں بھی ماہوار مہران کا معیار کافی بلند تھا، تاہم شکارپور سندھ سے بولچند راجپال نے محض سندھی زبان وادب کی ترقی کا مقصد پیش نظر رکھ کر جو ''سندھی ادب'' کے نام سے رسالہ جاری کیا۔ اس کے مستقل لکھنے والوں میں پیر علی محمد راشدی، ڈاکٹر ایچ ایم گربخشانی، ڈاکٹر ع-م داؤد پوتہ، بھیرومل آڈوانی، لال چند امر ڈنومل، خان بہادر محمد صدیق، رحیم داد خان مولائی شیدائی، مولانا عبدالکریم چشتی اور دیگر اسی طرح اعلیٰ پایہ کے ممتاز قلمکار شامل تھے۔ پیر حساب الدین راشدی، نہری دلگیر اور شیخ ایاز جیسے تازہ دم اور جوان سال قلمکار بعد میں اس قافلے میں شامل ہوئے تھے۔ (۹۵)

سندھو رسالے نے جب اپنی پالیسی میں سائنسی علوم اور تحقیق کی ہمت افزائی شامل کی اور تنقید نگاری خواہ جدید علوم پر تحریروں کی اشاعت پر زور دیا تب مذکورہ موضوعات پر لکھنے کا رواج بڑھا اور مذکورہ موضوعات پر تصانیف شائع ہونا شروع ہوئیں۔ ''سندھو'' کی خدمات میں ایک یہ بھی اضافہ ہوا کہ یہ پہلا سندھی رسالہ تھا جس کی کوششوں سے سندھی ادبی کانفرنسیں ہونا شروع ہوئیں اور سندھی مشاعروں کا نہ صرف خود اہتمام کیا بلکہ مشاعروں میں پڑھی جانے والی شاعری کو خود چھاپا اور چھپوانے کی تدابیر کیں۔

سندھی ادیبوں کی تنظیم ''جمعیت شعرائے سندھ'' نے کافی عرصہ بعد میں سندھو کی سرگرمیوں کو آگے بڑھایا۔ اس تنظیم نے بھی جب ''ادیب سندھ'' کے نام سے ایک ماہوار مجلّہ

شائع کیا تو طرحی مشاعروں کو فروغ ملا اور کئی ادبی کانفرنسیں منعقد ہونا شروع ہوئیں۔ (۹۶) ان تمام ادبی اہمیت کی حامل سرگرمیوں میں قیام اسلامی مملکت کے لئے اتحاد اور مسلم امت کی اہمیت کو پراثر انداز میں پیش کیا جاتا رہا۔

سندھی لغت نویسی کے کام کو تیز کرنے کے لئے بھی اس عہد میں کوششیں ہوئیں اور ایک چھ رکنی کمیٹی بنی جس میں صحافیوں سمیت معاشرے کے ہر طبقۂ فکر کے ماہرین کو شامل کیا گیا۔

مہاجرین کی آمد اتنی کثرت سے ہورہی تھی کہ انہیں فوری طور پر بحال کرنا مشکل ہوگیا۔ اس منظر کی عکاسی ایک لوک شاعر نے بھی ''بیت'' کی شاعری میں کی جس کا ترجمہ کچھ یوں ہوتا ہے:

''مہاجرین میدانوں میں جدہ جدہ موجود ہیں۔ یہاں جو ہندو آباد تھے، وہ بھی چلے گئے ہیں اور نہ معلوم کس راجہ کی ریاست میں جاگر جاگزین ہوتے ہیں.....'' (۹۸)

آبادی کی اس دو طرفہ منتقلی کی اگرچہ سیاسی وجوہات تھیں اور اس کا پاکستان میں ہمہ پہلو اثر ہورہا تھا، لیکن سندھی زبان وادب کے لئے بہت بڑا امتحان تھا۔ یہ ایک ایسا موڑ تھا جہاں تخلیقی ادب کی اشاعت تو درکنار محض ''شاہ جو رسالو'' جو کہ اہلِ سندھ کے لئے کلام مجید کے بعد دوسری اہم اور متبرک کتاب ہے، وہ بھی نایاب ہوگئی تھی۔ (۹۹)

سندھی زبان وادب میں سکوت کی اس کیفیت میں سندھی لکھنے، پڑھنے، کتابیں چھاپنے اور کتابوں اور کاغذوں کا کاروبار کرنے والے لوگ متحدہ متحرک ہوگئے۔ پرانے ادارے اور مراکز سرگرمی سے کام کرنے لگے جبکہ نئے مراکز کھولنے کا جذبہ اس قدر عام ہوا کہ بڑے شہروں کی گلیوں اور محلوں میں چھاپہ خانے، اشاعت گھر، لائبریریاں، بک ڈپو اور کتابوں کی خرید وفروخت کے مراکز قائم ہوتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ ''ہالا'' جیسے قصبے میں بھی ''رفیق پبلی کیشن'' کے

نام سے بڑا ادارہ بارونق مقام پر کھل گیا۔ (۱۰۰)

ایک طرف اس طرح کی سرگرمیاں بڑھ رہی تھیں تو دوسری سرف آبادی کو ہر سطح پر تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کی کوششیں تیز ہوگئیں اور چند سالوں کے اندر اسکولوں اور کالجوں کا سارے سندھ میں جال پھیلتا چلا گیا۔ ان کالجوں میں ''بزم ادب'' قائم ہوئے، مخزنوں کا جراء ہوا، طلباء کی سطح پر شاعری ہونے لگی اور مشاعرے منعقد کرنے کی ریت بڑھی۔ ایسے ہی ادبی وعلمی ماحول اور سرگرمیوں کے طفیل سندھی ادبی دنیا کو علامہ آئی آئی قاضی، ڈاکٹر ع-م داؤد پوتہ، غلام محمد گرامی، مولانا دین محمد وفائی، مخدوم امیر احمد، محبوب علی چنہ، لطف اللہ بدوی، جی-ایم سید، حیدر بخش جتوئی، راشدی برادران، مولائی شیدائی، شیخ عبدالرحیم، مولانا عبدالکریم، ڈاکٹر نبی بخش بلوچ اور اسی بلند قامت کے دیگر اساتذہ، صحافی، علماء، دانشور، محقق اور ہر شعبے پر کامیابی سے قلم آرائی کرنے والے اہل علم میسر آئے۔

ایسے ہی نامور اور بے لوث اہل قلم کی کوششیں تھیں کہ سندھی ادب کی ہمہ رخ ترقی اور توسیع ممکن ہوسکی۔ ڈاکٹر داؤد پوتہ جنہیں بعد میں شمس العلماء کا لقب بھی دیا گیا، انہوں نے عربی اور فارسی لغات کا سندھی سے تقابل وتجزیہ کرکے مختلف زبانوں اور ان کے علم وادب کے تقابل کا رواج عام کیا۔ ایسی ہی نئی روایت کے بانی عثمان علی انصاری نے افسانے کی صنف کو پرلطف، دلچسپ، اور پراثر انداز تحریر سے روشناس کرانے کی طرح ڈالی۔ آغا تاج محمد نے شہری آلودگی سے پاک، دیہاتوں میں پرورش پانے والی عام سندھی بولی کو ادب کے کینوس پر منتقل کرنے کا آغاز کیا۔ اللہ بچائیو سمہ نے بھی ملک کے انتہائی پسماندہ اور کٹھن زندگی گزارنے کے عادی، کوہستانی لوگوں کے انداز بیان کو علمی وادبی طبقے سے روشناس کرایا۔ محمد اسماعیل عرسانی نے سندھ کے دور دراز علاقے تھر کے نمکین تھریوں کے طرز گفتگو اور لہجے کو سندھ کے باقی

علاقوں میں بسنے والے تعلیم یافتہ طبقے سے آگاہی دی۔

چنانچہ سندھ کے مختلف علاقوں کے لہجوں، طرز گفتگو اور اندازِ بیان کو تصانیف اور تخلیقات میں پیش کرنے سے لوگوں کا ادب میں احساسِ شمولیت بڑھا اور اپنے دکھ اور تکالیف کا علم حلقے کی طرف سے ذکر سن کر اپنے اہل علم وقلم پر عوام کا اعتماد پختہ ہوا۔

ادبی نثر، یوں تو سولہویں صدی عیسوی سے مذہبی پس منظر کی تحریر میں رائج تھی لیکن زید ذکر دور میں ''کیمیائے سعادت'' اور بعض سندھی تماثیل کو ضبط تحریر میں لانے کے علاوہ وجو میں آنے اور افسانہ، ناول یا ڈرامہ کی کتابوں کی خرید وفروخت کے کاروبار نے سندھی میں نثر نگاری کے لئے وہی کام کیا جو فصل کے لئے کھادیں کرتی ہیں۔ چنانچہ تاریخ، تنقید، تحقیق، مضمون ومقالہ نگاری، ادارتی نوٹ لکھنے، انشاء پردازی، لغات نویسی، سائنس اور ہنر وحرفت کے علاوہ فنون لطیفہ، موسیقی اور تدریسی سرگرمیوں کو تیز کرنے کے لئے ہونے والی کوششیں جن میں تمام شعبہ ہائے تعلیم کے لئے نصابیں مرتب کرنے کا کام بھی شامل تھا۔ یہ سب سندھی نثر کو ہمہ رنگ ترقی دلانے کے لئے کافی تھا۔

ایک طرف ملی یکجہتی کے لئے اس طرح کی کوشش جاری تھی تو دوسری طرف اخبارات جرائد، سلسلہ وار اشاعت مشترکہ طور پر عوامی احساسات اور جذبات کی ترجمانی کرنے میں مصروف تھے۔

ان ہی ایام میں ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے ''عام رائے'' اور لعل محمد ''لال'' نے آفتاب جاری کیے۔ مذکورہ دونوں نقیبوں نے حقائق کو سنجیدہ انداز میں بڑی مدلل طریقے سے پیش کرکے عوام کے جذبات کی عکاسی کی۔

اسی طرح کا سنجیدہ مدلل اور منطقی انداز ان جرائد واخبارات نے بھی اختیار کیا تھا جو

محکمہ اطلاعات کے ماتحت تھے، مثلاً ''نئیں زندگی'' وغیرہ۔ ''نئیں زندگی'' ماہوار بن گیا تھا اور اس کا اجراء زیر تذکرہ انتشار اور افراتفری کے ایام میں ہوا۔ ان کے مدیر اپنے دور کے منجھے ہوئے، باصلاحیت، ذہین، بیدار دماغ، کہنہ مشق صحافی اور تجربے کار نثر نویس مولانا عبدالواحد سندھی کو مقرر کیا گیا تھا۔ مولانا (مرحوم) نے اپنے تجربے علم و لیاقت سے تدابیر پر عمل پیرا ہوکر ''نئیں زندگی'' کو سرکاری موقف کا نقیب بنانے کی بجائے عوامی اظہار کا ترجمان اور علمی وادبی ترقی کا ذریعہ بنایا، اپنے اعلیٰ معیار کے سبب اس کی ہر تحریر آج بھی حوالے کے طور پر استعمال کے قابل ہے۔ اس زمانے میں جس قلمکار کی بھی کوئی چیز شائع ہوئی وہ آج کا ممتاز قلمکار بن چکا ہے۔

مذکورہ سرکاری رسالے کے علاوہ اس وقت عام رائے، آفتاب، جھلک، مہران، اہل قلم، لطیف، اسان جی دنیا اور بہت سارے دیگر رسالے مشہور و مقبول ضرور تھے، تاہم ہلال پاکستان اور حبیب پبلیکیشن وغیرہ بھی بلحاظ مواد یا مقبولیت و اہمیت، ایک منفرد مقام رکھتے تھے۔ یہ تمام کے تمام وسائل قومی جاگرتا، سماجی اور ملکی حالات کے علاوہ سیاسی اور معاشی مسائل کے موضوعات کے ساتھ ساتھ تعلیم، تحقیق، تنقید اور تاریخ وغیرہ پر مبنی مواد کی اشاعت میں پیش تھے۔

اسی عرصے کے دوران ''سندھی ادبی بورڈ'' کا قیام عمل میں آیا جس سے ادب کی تعمیری اور تحقیقی سرگرمیوں میں مزید اضافہ ہوا۔ ''بورڈ'' نے سندھی علم و ادب کے علاوہ عربی، فارسی اور انگریزی میں ایسا نایاب، کم یاب اور کامیاب مواد شائع کیا جس کا براہ راست یا بلاواسطہ سندھی زبان وادب کی ترقی سے تعلق تھا۔ ایسے مواد میں لغات، فرہنگ، تاریخ، تنقید، تحقیق اور تخلیق کے موضوع پر تقابلی علوم، قلمی نسخوں اور لوک ادبی ذخیرے کی دستیابی اور اشاعت پر زور دیا۔ اس کام کے لیے ''بورڈ'' کو ایک معیاری رسالے کی ضرورت پیش آئی تو سہ ماہی ''مہران''

جاری کیا گیا۔

فروغ ادب کے سلسلے میں تیسری کوشش یہ کی گئی کہ کلاسیکی شعری اصناف، فن، فر لطیف، لوک ورثے اور دیگر بے توجہی اور پسماندگی کی شکار ادبی اصناف کو پھر سے مقبول کرنے اور انہیں شائع کرنے پر دھیان دیا گیا۔ جس کے مختصر مدت کے اندر خاطر خواہ نتائج نکلے۔

سندھ، سندھی ثقافت اور سندھی زبان و ادب کے وجود کو خطرات کے بارے میں خدشات کی، گذشتہ سالوں میں اٹھنے والی صدائیں جب صدائے صحرا ثابت ہوئیں اور کسی مسلسل اشاعتوں اور کوششوں کے باوجود ان مشکلات و مسائل کا ازالہ یا ان مسائل کو کم کرنے کی کوئی کوشش ہوتی یا تدبیر نکلتی نظر نہ آئی، تو انھیں افسانے کا موضوع بنایا گیا۔ ان موضوعات پر لکھے جانے والے افسانے کی عوام نے خوب پذیرائی کی اور تاریخ نے ان افسانوں کو اپنے عہد کا بے بہا ادبی سرمایہ سمجھ کر محفوظ کرلیا۔ (۱۰۲)

وجہ محض یہ تھی کہ اس دور کے افسانے کو تخلیق کاروں نے، زندگی کے حقیقی رنگوں سے مزین، جدید تقاضوں سے ہم آہنگ، ہیئت اور مواد میں نئے تجربات کرکے اس خطہ زمین کے مخصوص فطری، سیاسی، سماجی، تاریخی، مذہبی اور معاشی حالات کا آئینہ دار بنادیا ہے۔

سندھی ناول نگاری میں بھی کم و بیش مذکورہ موضوعات نظر آتے ہیں۔ ایسے ناولوں میں زمیندار، تباہی، سلطانہ، نوراں، ابیلا، لاش، راتیوں جاگن جے، نازبوء، کلب ائیں گھر، پردیسی جو پیار، آوارہ، دریاہ جی کپ تے، آسوری سینگار اور اس طرح لاتعداد ناول اس شعبے کے گلشن میں اس طرح نظر آتے ہیں جیسے یہاں نیا جوبن آ گیا ہو۔ (۱۰۳)

اگر چہ محمد عثمان ڈیپلائی بھی اس قافلے کے ساتھ ہمسفر تھے لیکن اس مسافر کی سوچ اور اظہار دونوں، باقیوں کے مقابلے میں منفرد ہیں۔ جب قیام پاکستان کی تحریک شروع تھی اور اس

تحریک میں اکثریت مسلمانوں کی تھی تو کٹر ہندو ادیبوں اور متنفر مزاج بھارتی قلمکاروں نے، مسلمانوں کی تاریخ سے چند اہم کرداروں پر مبنی چند ناول لکھے، جہاں ان کرداروں کا تمسخر اڑایا تھا۔ ڈیپلائی مرحوم نے ایسے قلمکاروں کا بھرپور جواب دینے کے لیے شیواجی، راجہ اندر، شیواجی محل اور اس طرح ان کے تاریخ کردار کے حقائق پر مشتمل ناول لکھے، جنھیں توقع سے زیادہ پذیرائی حاصل ہوئی۔

ان کے ناولوں میں ایک یہ بھی نیا پن ملتا ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کی تاریخ کے دلیر، شجاع، جان نثار اور سرفروشی کے حامل کرداروں پر ناول لکھے۔ ان موضوعات پر لکھے جانے والے ان کے ناولوں میں انور کمال پاشا، آزادی جی جنگ، غرناطہ اور دیگر ناموں کے کئی ناول موجود ہیں۔ ڈیپلائی مرحوم نے سندھ میں فرسودہ رسوم و رواج، اندھی عقیدت، مردہ پرستی، پیر پرستی اور شخصیت پرستی کے ساتھ ساتھ سود خوری کی لعنت سے نجات، زمینداروں کی بیگار سے چھٹکارا، جذبہ حریت اور اخوت و اتفاق کی برکت کے موضوعات کو بھی ناول کی زینت بنایا۔

اُن ایام کے دوران یہی موضوعات سندھی ڈرامہ نگاروں کے ہاں بھی ملتے ہیں۔ اگرچہ اس ادبی نخلستان میں مدتوں سے مسلسل سندھی اہل ہنر و فن ڈرامہ کے خوبصورت اور پھلدار درختوں کے پودے لگاتے آئے ہیں لیکن، ان کا ثمر محض سٹیج ڈرامہ کے ذریعہ تفریحی مقاصد حاصل کرنے کے لیے استعمال ہورہا تھا۔

چنانچہ اس تخلیقی صنف میں اس وقت انوکھا پن نمایاں ہوا جب قیام پاکستان کے بعد ریڈیو ڈرامہ نگاری کے تکنیک کو رواج ملا۔ ریڈیو ڈرامہ نویسی جہاں جدید طرز تحریر کا متقاضی ہے، وہاں فنی اور صوتی مہارت کی بھی طلب کرتا ہے۔ ان تمام رخوں کو سندھی قلمکاروں نے اتنی مہارت سے نمایاں کیا کہ کئی سماجی، تاریخی اور اصلاحی موضوعات کے علاوہ نہ صرف حب الوطنی،

عظمت انسانی اور تعلیمی مضامین پر مشتمل ڈرامے نشر کیے گئے، بلکہ نشر ہونے کے بعد اس قدر مقبول ہوئے کہ انھیں بار بار نشر کرنا پڑا اور بعد ازاں ''ریڈیو ڈرامہ'' کے سرنامے سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔

ناول، افسانے اور ڈرامے کی مقبولیت سے فلم سازی کے شعبے کو تقویت ملی اور پرائی زمین، مٹھوا شال ملن، پردیسی، عمر ماریٔ، سسئی پنھوں اور جام تماچی وغیرہ اسی عرصے میں بنیں۔ ان فلموں کی کامیابی نے فلم سازوں میں تحریک پیدا کی اور یکے بعد دیگرے کئی فلمیں بنتی چلی گئیں۔

شاعری فلم کا بھی لازمی حصہ ہوتی ہے اور شاعری نام ہی ہے شعور کا۔ چنانچہ جو ترقی پسند شعراء اس زمانے میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی بنا پر بے پناہ مقبول ہوئے، ان میں شیخ ایاز، عبدالرزاق راز اور نارائن شیام وغیرہ کو سرفہرست لکھا جاتا ہے۔ ان ترقی پسند شعراء نے مقامی ماحول کے دیکھے بھالے محاورے اور تشبیہات مثلاً امبیوں آنے کا موسم، نیم اور مہندی میں آنے والے بور کی خوشبو، خشک زمین پر پڑنے والی ساون کی بارش سے اٹھنے والی بھینی بھینی مہک، غریب کی جھگی کی طرح کا لباس، بنگلوں کے پہلو میں موجود غریب کا گھر، وسیع و عریض لان کے قریب مزدور کا پھٹا پرانا تنبو وغیرہ کو رواج دیا جسے بہت پسند کیا جانے لگا۔ قدامت پسند شعراء نے اس قسم کے شعراء کے خلاف محاذ قائم کر لیے اور ایسی شاعری کو غیر مہذب، ناشائستہ، فضول، فاحش، سماجی اقدار اور اسلامی معاشرے سے بغاوت وغیرہ جیسے الزامات سے نوازا اور کئی شعراء کی تصانیف ضبط کروائیں۔

جہاں تک شعری اصناف کا تعلق ہے تو آزاد نظم، گیت، سانٹ، ترائیل اور ہائیکو وغیرہ نے سندھی لباس ان ایام میں زیب تن کیا اور اس نزاکت و نفاست بھری پوشاک میں مزید نکھر

کر مقبولیت حاصل کی۔ان اصناف کے ہمراہ مجالس،محافل، مذاکروں اور اشاعت میں سندھ کو روائتی شاعری بھی اپنے سابقہ ثقافتی لباس میں ملبوس سج دھج کے ساتھ شامل و شریک ہوتی رہتی تھی۔

مخالفتوں اور مشکلاتوں کے باوجود شعراء نے ترقی یافتہ دنیا کی مذکورہ جدید شعری اور بدیسی اصناف کو سندھ کی شاداب زمین مہیا کر کے انھیں اس قابل بنایا کہ اس میں رس بھرے، مزیدار اور لذیذ پھلوں کا سا مواد آنے لگا۔

یہ بھی ان تخلیق کاروں کا کمال تھا کہ غزل جیسی غیر لچکدار شاعری کی ہیئت وساخت میں نئے نئے تجربے کر کے اسے مکمل مقصد و مضمون سمونے کے لیے ''غزل مسلسل'' بنادیا۔ اس صنف میں ویسی تشبیہات، استعارے اور محاورے پروکر اسے عام غزل سے ''سندھی غزل'' بنایا۔

شعری اصناف میں اس طرح کے تجربے ابھی جاری تھے کہ سیاسی سطح پر ایک اور بھونچال آیا اور ''ون یونٹ'' کے قیام کا تازیانہ سننے میں آیا۔ ☆

بظاہر تو یہ نظر آرہا تھا کہ ''ون یونٹ'' نے سندھ کے لیے سب سے زیادہ مشکلات پیدا کردی ہیں، جس کی وجہ سے یہاں کے عوام بغیر کسی مکتبۂ فکر، دین دھرم کے فرق اور طبقات اور گروہ کی تفریق کے اجتماعی طور پر ساری آبادی ون یونٹ کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑی ہوگئی۔ اس عہد میں جی ایم سید کا ادبی سطح پر کردار زیادہ فعال ملتا ہے۔

جی ایم سید صاحب (مرحوم) کو سندھی مورخین و محققین کے علاوہ اعلیٰ پایہ ادیبوں کی قطار میں بھی شمار کیا جاتا ہے۔ جس زمانے میں سندھی ادب، قیام پاکستان کے وقت آبادی کے تبادلے کے باعث تھوڑی مدت کے لئے ساکت ہوگیا تھا۔ قلمکاروں کا ذہن ماؤف اور کاروبار

☆ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں انگریزی روزنامہ ''ڈان'' کراچی مورخہ ۱۸ نومبر ۱۹۵۴ء (مصنف)

کرنے والوں پر سکتہ طاری ہوگیا تھا، اس زمانے میں میرپورخاص میں ہونے والی ادبی کانفرنس میں ایک فکر انگیز مقالہ بعنوان ''سندھی ادب چھو ائیں چھا لاء'' (سندھی ادب کیوں اور کس لیے) پڑھا جو بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔

آپ نے ''بزم صوفیائے سندھ'' بنائی۔ اس تنظیم کا کام لوگوں کو پیر پرستی، اندھی عقیدت اور فرسودہ رسوم کی بجا آوری سے روکنا اور رسوم کی ادائیگی پر اٹھنے والے اخراجات ختم کرنا تھا۔ نیز درگاہوں پر آنے والے زائرین کو بھی ادبی محفلوں میں شامل کرنا تھا، تاکہ ادب کو اجتماعی حالات کے تناظر اور مذہبی، سماجی واقتصادی مسائل سے ہم آہنگ مواد پیش ہوتا رہے۔ ان سرگرمیوں نے جہاں ''سید'' کو ادیبوں اور فنکاروں کا ہمسفر بنائے رکھا، وہاں زبان اور ادب کی ترقی کے لئے مستقبل میں راہیں متعین ہوئیں۔

آج جو سندھی ادیب اور شاعر اپنی تخلیقات وثقافت کے پس منظر میں بے باکی، بے خوفی اور جرأت کے ساتھ پیش کرتا ہے، یہ سب اس وقت ہموار کی ہوئی راہوں پر چلنے کا نتیجہ ہے جو راہیں سندھی ادب سے شاہ عبداللطیف اور سچل سرمست کے بعد ''گواچ'' گئی تھیں۔

زیر تذکرہ دور سے لے کر اب تک مذکورہ موضوعات سندھی ادب کے لئے اس قدر لازم اور اہم بن چکے ہیں کہ اگر کوئی مخزن، رسالہ، پبلی کیشن، افسانہ، ڈرامہ اور ناول ثقافتی پس منظر سے دور ہے، مدلل نہیں ہے، اس نے حقائق سے چشم پوشی کی ہے، حب الوطنی کے پرچار سے عاری ہے، انسانی کیفیات وجذبات کی عکاسی شامل نہیں کی تو اسے ادب کے زمرے میں بھی نہیں لایا جاتا اور نہ اسے معیاری ادب تسلیم کیا جاتا ہے۔

سید کے ہمراہ سندھ کی ایک اور اہم شخصیت، حیدر بخش جتوئی بھی ہر سفر میں اکھٹی نظر آتی رہی ہے۔ حیدر بخش کا سال پیدائش ۱۹۰۱ء جائے ولادت لاڑکانہ تھا۔ تعلیم مکمل کرنے کے

بعد ریونیو کے محکمہ میں ملازمت کی اور ترقی پاکر افسر بنے۔ (۱۰۴)

اگر چہ آپ کی طبیعت طالب علمی کے زمانے سے لے کر تحریر، تقریر اور شعر وشاعری کی طرف مائل تھی، لیکن بوجہ حساس طبیعت، ان سے زمینداری، مظالم، رشوت، غریبوں سے زمینداروں کی بیگار، قرض میں فصل لے جانے اور کسانوں کو اپنے تابع رکھنے کے لئے ایک ایک روپے کی خاطر انہیں تڑپانے اور کسان کو بیوی بچوں سمیت اپنا غلام سمجھنے کی روش برداشت نہ ہوئی، جس پر وہ ہمیشہ کرب ودرد میں مبتلا رہے۔ چنانچہ ان داستانوں کو شاعری میں سمونا آپ کا معمول بن گیا۔ ملازمت میں رہ کر آپ نے ''تحفۂ سندھ'' کے نام سے مجموعہ کلام شائع کرایا۔

بعد ازاں علامہ محمد اقبال کی تخلیق ''شکوہ جواب شکوہ'' سے متاثر ہوکر آپ نے بھی ''شکوائیں جواب شکوہ'' تخلیق کیا، جس میں کائنات کے خالق سے سقیم حالت میں گزارنے والے غریبوں کا شکوہ کیا گیا تھا۔ آپ کی یہ تخلیق متنازعہ بن گئی۔ مذہبی حلقوں نے خوب تنقید کی، جبکہ ترقی پسند ادیبوں اور عوام نے خوب پذیرائی کی۔ یہ حالات آپ کی شہرت اور ملازمت میں اضافے کا باعث بنے۔ ''ان دنوں کسان کو اپنی پیداوار میں کوئی حق حاصل نہیں تھا۔ اس کی قسمت کی طرح اس کی پیداوار کا مالک بھی زمیندار ہوا کرتا تھا۔'' (۱۰۵) دوسری طرف پیسے کے بل بوتے پر عدل و انصاف کو خریدنا معمول میں شامل تھا۔ تیسری طرف پاکستان کی تحریک میں شامل سندھی نوجوانوں پر انگریزوں کے مظالم میں شدت آتی گئی۔ ۱۹۴۳ء میں اس قسم کے دوراہے نے انہیں ملازمت سے مستعفی ہونے پر مجبور کیا اور عملی طور پر سیاست میں آنے کا فیصلہ کیا۔

آپ کی شاعری کا دوسرا مجموعہ ''آزدیٔ قوم'' شائع ہوا۔ اس شاعری کا موضوع حصولِ آزادی کے لئے شعوری کوششیں اور آزادی کی اہمیت وافادیت تھا۔ آپ کی شاعرانہ صلاحیتوں اور بامقصد شاعری کے اعتراف میں علماء اور نقادوں نے کہا تھا کہ: ''سندھ نے جو بڑے بڑے

موریانی، رشید بھٹی، قمر شہباز، طارق اشرف، امر جلیل، نسیم کھرل، سرویچ سجاولی، علی بابا، عا
امین، راشد مورائی، خاکی جویو، فتاح ملک، میر محمد پیرزادو اور بہت سارے اعلیٰ صلاحیتوں کے
مالک تخلیق کار موجود تھے، جن کے نقشِ قدم پر چلنے سے سندھی ادب آج منفرد اور ممتاز مقا
پر فائز ہے۔ (۱۰۸)

یہ اسی عہد کے قلمکاروں کی کوششیں تھیں کہ اس زمانے میں اتنا تاریخی، علمی، ادبی او
اصلاحی وثقافتی ادب شائع ہوا کہ پاکستان کی بنگالی کے سوائے کسی زبان کا سندھی میں شائع شد
مواد سے تقابل نہیں کیا جاسکتا۔ جہاں ادبی اوراق کی تعداد کی اشاعت زیادہ تھی وہاں اخبارات
رسائل، جرائد اور پبلیکیشن کے تحت شائع ہونے والے کتابی سلسلے میں بھی باقی زبانوں کے
مقابلے میں زیادہ نکلتے تھے، لیکن بنگلہ زبان میں ان کی تعداد سندھی سے زیادہ تھی، جس کی وج
یہ تھی کہ بنگالیوں کی آبادی بھی سندھ کی آباد سے دس گنا بڑی تھی۔ (۱۰۹)

یہ سیاسی دباؤ کا ہی اثر تھا کہ اہلِ سندھ نے اسے ''جہد بقا'' کی جدوجہد گردانا
انہوں نے ادبی وقلمی محاذ میں اپنے وجود کا ثبوت دینے کے لئے خوب سرگرمی دکھائی، جس کے
باعث ادبی، تنقیدی، تحقیقی، تاریخی اور انشاء پردازی کے شعبوں کو مالا مال کرنے کے علاوہ
افسانے، ناول اور ڈرامے کے ساتھ ساتھ نثر اور نظم کی ہر صنف میں سندھی ادب خود کفیل بنا۔

اسی جذبے کے تحت پیر حسام الدین راشدیؒ نے سندھ، سندھ کی تاریخ، ادب او
ثقافت کے متعلق مواد فارسی سے سندھی میں منتقل کرنے کا دوبارہ رواج پختہ کیا۔ اس رسم کی تقلید
خوب پسند ہوئی اور بہت سا مواد شائع ہوا۔

جیمس برنس(Iemes Burns) کی انگریزی کتاب A visit to the Court of Sindh
اسی عرصے میں محمد حنیف صدیقی نے ''سندھ جی دربار'' کے نام سے ترجمہ کیا اور یہ کتاب

بیدار دماغ شعراء پیدا کیے ہیں، ان میں سے قیام پاکستان کے وقت جو صف اول کے نامور شعراء ہیں، حیدر بخش جتوئی ان میں سرفہرست ہیں۔'' (۱۰۶)

آپ نے ''دریاہ شاہ'' کے عنوان سے ایک طویل ترین مدح تخلیق کی۔ ایک اور ''مسدس'' اور ''ہجو'' بھی لکھی۔ یہ سب چیزیں اتنی مقبول ہوئیں کہ آج بھی بچوں اور بڑوں کو ان کے اقتباسات یاد ہیں۔ جس اخبار اور رسالے میں آپ کی جوکوئی بھی تحریر شائع ہوئی، اس کی اشاعت ''دوگنی'' ہوجاتی۔ (۱۰۷) سندھی اور انگریزی میں آپ کی تصانیف تیس کے قریب ہونگی جو رفتہ رفتہ شائع ہورہی ہیں، جنہیں ہیئت اور موضوع کے اعتبار سے اس طرح تقسیم کیا جاسکتا ہے: کلام پاک میں انگریزی کا ریویو (Review)، ڈرامہ، کہانی، گیت، نظم، قومی نغمات، مخمس، مدح اور مضامین وغیرہ۔ اگرچہ اس عہد کا تمام سندھی ادب ''مزاحمتی'' شعبے میں آتا ہے، لیکن جتوئی مرحوم کی تمام تصانیف وتحریریں تو مزاحمتی ادب کی فہرست میں بھی نمایاں نظر آتی ہیں۔

ون یونٹ کا زمانہ سندھی زبان وادب کے لئے ایک طرف ''آب حیات'' ثابت ہوا تو دوسری طرف قارئین کا بہت ہی وسیع حلقہ بنانے میں کامیاب ہوا، جس کے باعث جہاں سندھی عوام کا اپنے اہلِ قلم پر اعتماد بحال ہوا اور ان کی عزت واحترام میں اضافہ ہوا تو دوسری طرف اہلِ قلم کی تعداد بھی کئی گنا بڑھ گئی۔ اہلِ قلم کے سرگرم گروہ اور اپنے لیے پڑھنے والوں کا وسیع حلقہ پیدا کرنے والے گروپ میں بے شمار نام ملتے ہیں، جن میں جی ایم سید، حیدر بخش جتوئی، قاضی فیض محمد، غلام محمد لغاری، پیر حسام الدین راشدی، پیر علی محمد راشدی، سوبھوگیان چندانی، عبدالکریم گدائی، محمد امین کھوسو، شیخ ایاز، نیاز ہمایونی، شمشیر الحیدری، بردو سندھی، تنویر عباسی، پروانو بھٹی، محمد ابراہین جویو، ایاز قادری، نور عباسی، علی احمد بروہی، ڈاکٹر خلیل، ڈاکٹر نجم عباسی، استاد بخاری، ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، خواجہ غلام علی، حمید سندھی، غلام ربانی آگرو، ابراہین منشی، بشیر

۱۹۶۴ء میں حیدرآباد سے شائع ہوئی۔ رچرڈ برٹن کی مشہور کتاب Sindh and the races that inhabit in the vally of Indus کا بھی اسی زمانے میں محمد حنیف صدیقی نے ''سندھو ماتھری ائین ان میں رہنڈ قوموں'' کے عنوان سے ترجمہ کیا، جسے ۱۹۷۱ء میں شائع ہونے کا موقع ملا۔ تھامس جیفرسن کی کتاب کا رشید بھٹی نے ''ریاست ائین آزادی'' کے سرناویں سے ترجمہ کیا جو بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔ فریزر کی کتاب کو ''جادو ائیں سائنس'' کے نام سے شائع کیا گیا۔ اس کا ترجمہ سومار علی شیخ نے کیا تھا۔ اوہنری جیسے ممتاز افسانہ نگار کے افسانوں کا مجموعہ ''چونڈ آمریکی افسانہ'' کے نام سے اور ''دنیا جا عظیم افسانہ'' عالمی سطح پر شہرت یافتہ انگریزی میں شائع افسانوں کا ترجمہ تھا۔ اسی عرصے میں رچل فیلڈ کی ایک کتاب کی ''آمریکی لوک ادب'' کے نام سے اشاعت ہوئی۔

ایک طرف غیر ملکی زبانوں سے چیدہ چیدہ اور معروف ومشہور تخلیقات سندھی میں شامل کی جارہی تھیں تو دوسری طرف سندھی میں اپنی مثال آپ افسانے اور عالمی سطح پر معیاری ادب کا حصہ بننے کے قابل کہانیاں دیگر ترقی یافتہ زبانوں میں منتقل کرنے کا رواج عام ہوا۔

عالمی شہرت یافتہ جرمن سکالر، محقق اور دانشور ڈاکٹر شمل نے ''مہران جون چھولیوں'' میں شائع کہانیوں میں سے تین کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ حشو کیول رامانے نے بہترین سندھی افسانوں کا انتخاب کر کے ان کا انگریزی میں ترجمہ شائع کرایا جن میں غلام ربانی آگرو کا ایک افسانہ بھی شامل تھا۔ (۱۰)

محمد عثمان ڈیپلائی، بشیر موریانی، غلام ربانی آگرو، جمال ابڑو، شیخ حفیظ، سراج الحق میمن، ابراہیم خلیل، ابن حیات پنہوار، ع-ق شیخ اور جمال رند وغیرہ زیر بحث زمانے کے مشہور مقبول کہانی کاروں میں سرفہرست ہیں جبکہ اس دور میں خواتین افسانہ نگار جنہوں نے اپنے

ماحول کا بھرپور اثر لیا، جن کے بھائی، شوہر، والد، والدہ، بہن یا کوئی اور اس طرح کا قریبی عزیز ریاستی تشدد کا نشانہ بنا، ان کی کہانیوں، ڈرامے، شاعری اور ادب کی دیگر اصناف میں بھی اس طرح جوش، جذبہ، درد والم، غم اور غصے کی شدت پائی جاتی ہے۔

ایسی تخلیق کار خواتین میں بیگم زینت عبداللہ چنہ اور ثمیرہ زرین، خیرالنساء جعفری اور مہتاب محبوب وغیرہ شامل رہیں۔ سندھی قلمکاروں کے اس قافلے میں زن ومرد غالبًا اس لئے ایک ہی احساس کو تحریر میں سمو رہے تھے کہ سب میں یہ خدشہ یکساں جنم لے چکا تھا کہ ''اب ایک سماج دوسرے سماج کو اپنے طابع رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔''

چنانچہ وجود برقرار رکھنے کے لئے سرتوڑ کوششیں ہونے لگیں، جن کی کامیابی اس وقت یقینی بن سکتی تھی، جب ادارے وجود میں آجائیں۔ سب سے پہلے سندھی ادبی انجمن قائم ہوئی، بعد میں سندھی ادبی سنگت کی بنا ڈالی گئی۔ آخر الذکر تنظیم کی تاریخ دراصل سندھی زبان، ادب اور ثقافت وتاریخ کے تحفظ، بقاء اور ترقی کی کہانی ہے۔ اسے قائم کرنے کا ایک اور مقصد یہ تھا کہ ادب کی مجموعی اصناف کو وقت گزارنے کا وسیلہ، تفریح طبع کا سامان مہیا کرنے اور فراریت تلاش کرنے یا عیاشی کا ذریعہ بنانے کی بجائے اسے بامقصد بنایا جائے، عالمی امن اور انسان ذات کی اجتماعی ترقی، بقاء اور سلامتی کا ضامن بنایا جائے۔ (۱۱۱) یہ اس تنظیم کی سرگرمیاں ہی تھیں کہ بعد میں تخلیق ہونے والے ادب اور ماضی میں ادب کے نام پر شائع ہونے والے مواد میں دن رات کا فرق نظر آتا ہے۔

مثلاً اب تک سندھی زبان میں دوھے نما شاعری میں زبان کی سادگی، سلاست، لطافت، نزاکت، شائستگی اور الفاظ کی جادوگری زیادہ ہوتی تھی۔ اس میں ماحول، حالات، اور حقائق کی ترجمانی نہیں کی جاسکتی تھی۔ (۱۱۲)

ماضی کی سندھی شاعری میں مجموعی طور پر امن ومحبت کا بھرپور پیغام موجود تھا اور یہ درویشی اور پارسائی کی مشترکہ قابلِ رشک خصوصیات وخصائل کی حامی بھی تھی، لیکن وہ اس لائق نہیں تھی کہ سماج میں حالات وواقعات کے مطابق تبدیلی کا باعث بن سکے۔ یہی حالت سندھ کی روائتی شاعری، کافی کی تھی۔ اس شعری صنف نے شعری ادب میں اضافہ کیا لیکن عوامی احساسات کی ترجمانی کرنے سے یہ صنف بھی قاصر تھی۔

گیت نے اگرچہ تھوڑا عرصہ پہلے بامقصد شعری صنف کے طور پر اپنے آپ کو منوایا تھا، لیکن قیامِ پاکستان کے سیاسی وسماجی حالات میں تیزی سے آنے والے تاریخی حالات نے اسے جدید تحریک کی شاعری بنادیا۔ اس میں ہرقسم کے فنی اسباب، مقامی ماحول، رسوم ورواج اور ثقافتی حالات سے مطابقت رکھنے کے حقائق سمونے کی گنجائش تھی جس کی وجہ سے فوری طور پر شاعری عوامی امنگوں اور جذبوں کی ترجمانی کا سبب بن گئی۔ بردہ سندھی نے گیت کو اس قدر ترقی دی کہ گیت مفہوم ومقاصد کے اظہار کا ذریعہ بن گیا۔ یہی وجہ تھی کہ بردہ سندھی ''گیت کا بادشاہ'' بن گیا تھا۔

سندھی نظم تو گیت سے بھی مقبولیت وشہرت میں آگے آنے والی شعری صنف ثابت ہوئی۔ اس شاعری میں سندھی شعراء نے نئے موضوعات سموکر، جدید تجربات کی مدد سے اس قابل بنایا کہ اسے ہر ایک نے اپنی مقامی صنف سمجھنا شروع کیا۔ اگرچہ کئی شعراء کی اس شعری صنف میں مہارت کو تسلیم کیا گیا، تاہم ہری دلگیر کو سندھی نظم کی صنف میں جدت وندرت لانے والوں کا علمبردار کہا جاتا ہے۔ (۱۱۳)

غزل جو کہ ایرانی حکمرانوں کے ہمراہ تمام برصغیر میں آئی اور مقبولیت حاصل کرتی رہی ہے، وہ سندھی ادب کا بھی حصہ بنی اور اسے فارسی ہیئت، مواد، اصطلاحوں، استعاروں، محاوروں،

تشبیہات اور قافیوں سمیت سندھی عوام نے قبول کرنا شروع کیا تھا، لیکن قیام ون یونٹ کے بعد سیاسی تبدیلی کے باعث ادب میں حقیقی رنگ بھرنے اور بامقصد پیغام کا ذریعہ بنانے والی کوشش نے غزل کو بھی تبدیلی کے لائق گردانا اور غزل بھی مسائل بیان کرنے کا ذریعہ بنتی چلی گئی۔ کشن چند ''بیوس'' کو غزل کو ''مقصدیت'' کا وسیلہ بنانے والی تحریک کا بانی سمجھا جاتا ہے، جبکہ شیخ ایاز، ہری دلگیر اور نارائن شیام کے نام بھی تجرباتی دور کی بانی کاروں میں شامل کیے جاتے ہیں۔

جہاں مذکورہ عشرۂ سال میں دیگر ادبی شعبہ جات میں تبدیلی آئی، مقامی مسائل اور مقصدیت کو اہمیت ملی، وہاں جبر اور مشکل میں زندگی گزارنے والے حالات، سندھ کے کسان، استاد، طالب علم، ادیب، شاعر، محقق، مؤرخ اور مزدور سمیت ہر زندہ شخص میں شعوری تبدیلی لے آئے اور وہ حق وناحق، سچ اور جھوٹ، ظلم وانصاف میں آسانی سے تمیز کرسکتا اور اس کا واضح الفاظ میں اظہار کرسکتا تھا۔ اس کا ثبوت سادہ ذہن کے ایک نوآموز شاعر کے ان الفاظ سے ملتا ہے:

سندھ کی تصویر بنانا چاہتا ہوں،
مشورہ مجھے یہ دو اے یارو،
نقش میں رنگ سرخ بھر دوں یا
محض حاشیہ سیاہ لگاؤں؟ (۱۱۴)

ایسے ہی منظر کی عکاسی ایک شعر میں کی گئی ہے۔ درجہ ذیل میں اس کا ترجمہ دیا گیا ہے:

زبانوں پر ہیں تالے اور تخیل پر ہیں پہرے
لکھنے سے بھی گئی ہیں اور بولنا بھی بند ہوگیا ہے
اس حال میں بھی اگر کوئی ہمیں ہمدرد ملا تو

اس سے گونگوں کی طرح اشارے کیے ہم نے (۱۱۵)

ایک اور شاعر نے ماحول کے آئینے میں یہ عکس دیکھا:

ہم ظلم کو مات دینے کی بات کہتے رہے
سر عام ہر بات کرتے رہے
تم ہمیں کتنا بھی کیوں نہ دھمکاؤ ڈراؤ
ہم تو رات کو رات کہتے ہیں اور کہتے رہیں گے (۱۱۶)

علماء، ادیبوں، قلمکاروں اور شاعروں کی بہت بڑی کھیپ میسر آئی جو آج کے دور میں سندھی علم وادب کی قیادت کر رہی ہے۔ یہی وہ باشعور محقق وقلمکار ہیں جن کی تحریروں میں منطق ہے اور مقصد ہے۔ موضوع کے اعتبار سے یا مزاج کے لحاظ سے، جن تحریروں میں وطن پرستی، حب الوطنی، حقوق کے حصول کے لئے جدوجہد، نا انصافی کے خلاف بے باکی، جرأت، ہمت، عالمی مسائل پر خیال آرائی، عالمی سطح پر مظلوم اقوام سے اظہار یکجہتی اور اپنے ثقافتی، تاریخی، سیاسی، سماجی اور علمی وادبی وجود کے خلاف مزاحمت موجود نہیں ہوتی، انہیں پڑھنے والے تو نہیں ملتے۔

اس دور میں جن رسائل اور جرائد نے جرأت اور بے باکی کا مظاہرہ کیا ان میں ''روح رہاں'' سرفہرست رہا اور اس میں شائع شدہ تحریر آج بھی ''حوالے'' کا کام دیتی ہے۔ دوسرے نمبر پر ''ماہوار سہنی'' کا نام بھی بڑی عزت واحترام سے لیا جاتا ہے۔ تیسرے نمبر پر ماہوار سچ ڈائجسٹ، طیر ڈائجسٹ، ہفتہ وار ''انسان'' اور بہت سے دیگر رسائل واخبارات شامل تھے۔

یہ ان رسالوں کی ہمت افزائی ہی تھی کہ مذکورہ بالا موضوعات کو شعر وشاعری کے ذریعے بیداری پیدا کرنے کا وسیلہ بنانے کے علاوہ ان عنوانات کو ناول، افسانے اور ڈرامہ میں بھی کلیدی حیثیت مل گئی۔

سندھی ڈرامہ اپنے معاشرے میں صدیوں سے رائج رہا ہے۔ پہلے ایام میں شادی بیاہ کے موقعوں پر یا کسی معزز مہمان کی آمد پر بامقصد کہانی اور تفریح طبع کے مواد پر مشتمل ''سانگ'' رچائے جاتے تھے۔ ان کی پیروی بعد میں ہندومت میں ہونے لگی، جسے انہوں نے دھرمی مقاصد کے لئے ''رام لیلاؤں'' کا نام دیا۔ سندھی ہندوؤں نے رام لیلائیں بھی لکھیں اور پیش کیں، تاہم جتنی شہرت سندھ میں ''ناٹک'' کو ملی وہ بہت زیادہ تھی۔ ناٹک میں تاریخ، سماج، مذہب اور اصلاح احول کے موضوعات سموئے جاتے تھے لیکن مذکورہ ''ناٹک نویسوں'' کا نام کہیں نظر نہیں آتا۔

البتہ باقاعدہ طور پر تحریری ڈرامہ مرزا قلیچ بیگ کا ہے جو انہوں نے ۱۸۸۰ء میں ''خورشید'' کے نام سے لکھا۔ یہ ڈرامہ بعد میں اسٹیج بھی ہوا، اور مقبولیت بھی بڑی حاصل ہوئی۔ بعد میں جن تخلیق کاروں نے اس جدید فنِ عبارت کو نکھارا، پسندیدہ بنایا اور مشہور کیا ان میں پروفیسر منگھا رام ملکانی، خانچند دریانی، لطف اللہ بدوی، شیخ عبدالرزاق راز، محمد اسماعیل عرسانی، امید علی سرائی اور محمد عثمان ڈیپلائی وغیرہ پہلی صف میں بیٹھے نظر آتے ہیں۔ یہ انہی اہلِ قلم کی کوششیں تھیں کہ سندھی میں ڈرامہ بڑی تیزی سے مقبولیت کی طرف رواں دواں ہوا۔ نورجہاں جوپٹ، سجائی موڑی اور کئی دوسرے ڈرامے اس دور میں شائع ہوئے۔

قیام پاکستان کے بعد ایسے بارہ ڈراموں کا انتخاب کرکے انہیں ''ڈزن ڈائیلاگ'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔ اس سے ڈرامہ نگاری کی مقبولیت معلوم ہوتی ہے۔ ان دنوں اگرچہ اسٹیج ڈرامہ کا بھی بڑا رواج تھا لیکن جب سندھ کے بڑے شہر کراچی میں ریڈیو سٹیشن قائم ہوا تو دیگر پروگراموں کے علاوہ ڈرامے کو بھی تفریحی پروگرام کے طور پر اہمیت ملی۔ سندھ میں جو ابتدائی ریڈیو ڈرامے نشر ہوئے، وہ محمد علی چاگلہ کے تھے جو خود بھی ریڈیو کے افسر تھے۔

ریڈیو پاکستان حیدرآباد میں بنا۔ اس ریڈیو سٹیشن نے سندھی زبان کے فروغ، سندھی ادب کی ترقی اور قلمی سرگرمیوں کو عام کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ اس سٹیشن کی نشریات اگرچہ ماضی میں پورے سندھ میں سنی نہیں جاسکتی تھیں، لیکن ریڈیو ڈرامے نے ان پروگراموں کو اس قدر پرکشش بنایا کہ عوام کا ریڈیو کی فری کوئنسی بڑھانے کا مطالبہ مان کر اسے زیادہ علاقے تک نشریات سنانے کے قابل بنایا گیا اور عوام کے ہی مطالبے پر ریڈیوں ڈرامہ کا دورانیہ ایک گھنٹے کا کیا گیا۔ (۱۱۷)

حیدرآباد کے علاوہ کراچی کا میڈیم ویو بھی ایسے دلچسپ پروگرام ریلے کرتا تھا، جس کی وجہ سے کراچی اور اس کے گرد ونواح کی سندھی آبادی، سندھی ڈرامے اور دیگر پروگراموں میں دلچسپی لیتی تھی۔ کئی ڈراموں نے نشر مقرر کا اعزاز حاصل کیا۔ قسط وار ڈرامہ اور گیتوں بھری کہانی نشر کرنے کا رواج بھی ان ایام میں پڑا۔ اس وقت کے مقبول ریڈیو ڈرامہ نگاروں میں آغا سلیم، شمشیر الحیدری، عبدالکریم بلوچ، امر جلیل، ممتاز مرزا، قمر شہباز، منظور نقوی، عبدالقادر جونیجو، قاضی خادم، علی بابا، شبیر چنہ ناز، منظور قریشی، منظور نقوی، امداد حسینی، مصطفیٰ قریشی، ایاز قادری، ابنِ حیات پنوہر، سراج الحق میمن، الہ بخش شاہ، الٰہی بخش بلوچ اور ظہور انصاری وغیرہ شامل تھے۔ یہ سب اس وقت جواں سال تخلیق کاروں میں شمار ہوتے تھے، لیکن اب ان کا شمار کہنہ مشق اور تجربہ کار ڈرامہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ 'سنجا سیج پلنگ' (سنجے سیج پلنگ)، دریا خان اور دوسرے اہم موضوعات پر ان کے لکھے ریڈیو ڈرامے کا آج بھی ریڈیو پاکستان کی تاریخ میں اعلیٰ مقام ہے۔ ایسے ڈراموں کو ''پاچھائیں پڑلاؤ'' کے نام سے مجموعے کی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ قارئین کا وسیع حلقہ نصیب ہوجانے اور مقبولیت کے باعث چند ایک ڈرامے سٹیج پر بھی کافی کامیابی حاصل کر گئے۔

۱۹۶۰ء میں جب سندھی ڈرامے نے ٹیلی ویژن کا رخ کیا تو مذکورہ ڈرامہ تخلیق کار نے سابقہ ادوار میں سماجی طبقات کے نقصانات، سیاسی استحکام کی ضرورت، ترقی کی خواہش، سائنس، تعلیم، ہنر وحرفت، جدید ٹیکنالوجی کے حصول، معاشی خوشحالی، مذہبی پرچار اور تاریخی تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے ڈرامے لکھے، جنہیں بہت زیادہ پذیرائی ملی۔

تھوڑے ہی عرصہ بعد ٹی وی ڈرامہ نگاروں کی جس طویل قطار میں آغا سلیم، شمشیر الحیدری، عبدالکریم بلوچ، امر جلیل، عبدالقادر جونیجو، ممتاز مرزا، قمر شہباز، منظور قریشی، علی بابا، امداد حسینی، شبیر چنہ ناز اور قاضی خادم نظر آرہے تھے، ان کے برابر میں نورالہدیٰ شاہ، قاضی خادم، سید ماکن شاہ اور محمود مغل کے علاوہ کوئی جواں سال تخلیق کاروں کی نشستیں بھی موجود ہیں جنہیں اپنے ہمراہیوں کے ساتھ ملکی اور غیرملکی لوگ ڈرامہ نگاری کی وجہ سے جانتے ہیں۔ سندھی ڈرامہ نگاروں نے سخت محنت کی، منفرد موضوعات کو متعارف کرایا اور جس بڑی بے باکی، جرأت اور دلیری سے بامقصد ڈرامہ تخلیق کیے اور معاشرے کے ناسور کی نشاندہی کی اور جراحی کی ہے، اس نے ان کی تخلیقات کو عالمی سطح پر نمایاں کیا ہے۔ کئی سندھی ڈرامے اردو اور انگریزی میں ترجمہ ہوکر مختلف ممالک میں اپنا مقام پیدا اور عالمی مقابلوں میں انعام حاصل کرچکے ہیں۔ نہ صرف ڈرامہ نگاری، بلکہ اب تو فن اداکاری، ڈرامہ نگاری کے فن اور فنکاری کے متعلق بھی کئی کتابیں سندھی میں شائع ہوچکی ہیں۔

ان تخلیق کاروں میں سے کئی وہ ہیں جنہیں افسانہ نگاری میں بھی بلند مقام حاصل ہے۔ ڈرامہ نگاری کی طرح افسانہ نویسی کے لئے بھی نثر نویسی کی اعلیٰ خوبیاں درکار ہوتی ہیں۔ سندھی میں چوتھی صدی عیسوی کی کہانی ''موکھی ئیں متارا'' (جس کا ذکر اٹھارویں صدی عیسوی میں شاہ عبداللطیف بھٹائی نے بھی کیا ہے) سے افسانے کا آغاز ہوتا ہے لیکن اس صنف میں باقاعدگی

انیسویں صدی عیسوی میں اس وقت پیدا ہوئی جس وقت انگریزوں نے سندھ پر قابض ہونے کے بعد سندھی زبان کو ''نیا الف ب'' دیا جسے موجودہ ''معیاری رسم الخط'' کہا جاتا ہے۔

نیا رسم الخط رواج میں آتے ہی نثر نویسی کو فروغ ملا اور دیگر نثری اصناف کے ساتھ ساتھ سندھی افسانہ بھی لکھا جانے لگا۔ اس ضمن میں شاہ لطیف بھٹائی کی تماثیل میں سے ''سورٹھ رائے دیاچ'' کو سندھی افسانہ کے زمرے میں لایا جاسکتا ہے، جسے ۱۸۴۹ء میں پہلی بار افسانوی انداز میں لکھا گیا تھا۔ اسی طرح سید میراں محمد شاہ اول نے، جو ۱۸۶۱ء میں تفریحی مقاصد اور اخلاقی اصلاح کی خاطر کہانیاں لکھیں، وہ بھی ابتدائی سندھی افسانے کے طور پر موجود ہیں۔ تاہم موجودہ ترقی یافتہ سندھی افسانہ بیسویں صدی عیسوی میں نمایاں نظر آتا ہے جس میں بعض بنگالی افسانوں کے تراجم کے ساتھ ساتھ کچھ طبغزاد افسانے بھی ہیں۔ ایسے افسانوں میں ''دھرم رائے جی وہی'' (دھرم رائے کا جوبن) اور ''جیوت جوجس'' (۱۹۱۵ء) وغیرہ کو اولیت حاصل ہے (۱۱۸)

مؤرخین کی نظر میں اگرچہ لالچند اور بھیرومل کا بھی سندھی افسانے کی ابتدائی ترقی میں بڑا ہاتھ تھا، لیکن نثری صنف کو اپنی اصل منزل کی طرف گامزن کرنے والے نادر بیگ مرزا تھے جو کہ مرزا قلیچ بیگ کے فرزند تھے۔ نادر بیگ نے افسانے کو معاشی، معاشرتی، اخلاقی، پیار ومحبت اور جذباتی کیفیات سے سرشار کیا۔

البتہ سندھی افسانے کی ترقی میں شکارپور کے بولچند راجپال کا کردار اس لئے اہم ہے کہ انہوں نے ۱۹۳۲ء میں جو ''سندھو'' نامی ماہوار رسالہ جاری کیا، اس میں افسانہ نویسی کی بڑی ہمت افزائی کی گئی ہے۔ اس ماہنامہ میں مرزا نادر بیگ کے علاوہ پیر حسام الدین راشدی، عبداللہ عبد اور لطیف اللہ بدوی، امر لعل، عثمان علی انصاری، محمد صالح بھٹی، شیوارام، محمد خان غنی، محمد عثمان ڈیپلائی اور بہت سارے دوسرے شامل نظر آتے ہیں۔